R. N. 2885/57 Regd. No. A. 822

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

Telephone No 28
Telegrams: "ANJUMAN"

ہماری زبان

جلد ۲۱ - شمارہ ۷ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ فروری ۶۲ء

انیس قدوائی - ایم پی

مرزا غالب ــــــ گپ شپ

"یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"

میرا خیال ہے کہ یہ صرف غالب کا حسن ظن تھا۔ وہ متقی و پرہیزگار ہوتے، تب بھی حکیم آغا جان عیش یہی کہتے:

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور مشکل پسندی و مہمل گوئی کا خلعت ملامت یوں ہی انھیں ملا رہتا۔ بھلا ان کو قبل از وقت، ایک صدی پہلے ہندستان میں وارد ہو جانے کی ایسی جلدی کیا پڑ گئی تھی۔ پھر سے اب آئے ہوتے تو ہندوستان کیا سارا ایشیا بلکہ یوروپ تک ان کو سر آنکھوں پہ بٹھاتا۔ اور اپنے دیس والے بھی پلکیں بچھاتے۔ اپنے اشعار کو سخن فہموں اور سخن شناسوں کی زبان پر ہو نہیں، بشلوار و جامہ اور پٹکا پہنے چغتائی کے آرٹ میں مجسم دیکھتے۔ ان نکیلے سجیلے نقوش لانبی لانبی شمع جیسی انگلیوں، اور کٹار جیسی آنکھوں کو دیکھ کر غالب کیا کہتے؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ خیال تو یہی ہے کہ اس بانکپن اور نٹ روپ کو دیکھ کر مارے خوشی کے اپنا زانو پیٹ لیتے۔ ویسے مزاج ان کا بڑا تانا شاہی تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی طبع سلیم پر گراں گزرتا اور گریبان چاک کر بیٹھتے۔

گاندھی جی ٹھیک وقت پر آئے۔ زمانہ سازگار تھا۔ انھوں نے قدیم بزرگان دین کے ذاتی اور انفرادی عدم تشدد کو اس ٹھاٹھ سے ایجاد بندہ بنا کر اجتماعی شکل میں علانیہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ غالب کی جدت پسندی نے ایک ایسے دور تنزل میں جنم لیا جب پرانا

تعمیریں دم توڑ رہی تھیں اور نئی قدریں پرانے نظریوں سے ٹکرا کر سب کچھ توڑ پھوڑ دینے پر آمادہ تھیں۔ اس الٹ پلٹ میں ٹھکانے کی بات کون سنتا۔ اچھے اچھے بھلے مانس ان دنوں زندگی سے فرار کا راستہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ اور بڑے بڑے سورما اس فکر میں تھے کہ دہ خیال و تصور کی جنت میں پناہ مل جائے، تو کسی ماہ رو کے آنچل تلے دم لے لیں۔ خود غالب کا یہ حال تھا۔

"دل اسباب طرب گم کردہ در بند غم ناں شد
فراغت گاہ رہواں بی شود چوں باغ ویراں شد"

اپنی اس خانہ ویرانی کو دور کرنے کے لئے انھوں نے عرفان حقیقت، سیاست و مذہب سب کا چربا بنایا اور "آلودہ ہے" کر کے سب کے جام و سبو بنا ڈالے۔

مرزا غالب کو اپنی فارسی دانی اور فارسی گوئی پر بڑا ناز تھا۔ کہا کرتے تھے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

حالانکہ وہی بے رنگی اس رنگ رنگیلی دنیا کو اتنی پسند آگئی اور ارباب علم و فن نے اسے یہاں تک اچھالا کہ بہ جوش عقیدت منزل الہام تک کے قائل ہو گئے اور ملک کے ہر ملک میں اس بے رنگی کی آمیزش ہو گئی۔

بہر حال اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ فارسی ہو یا اردو غالب نے کہیں بھی خیال و تصور کو حقیقت و واقعیت کا جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ تجربات و مشاہدات کو شعر و سخن کا لباس عطا فرمایا ہے اور ان کی مقبولیت کا بڑا سبب یہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کوئی بات بھی کہنا چاہو، کسی موضوع پر بھی گفتگو ہو رہی ہو، کیسا ہی مذکور کیوں نہ ہو۔ غالب کا بر محل اور با موقع شعر زبان پر آ ہی جاتا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر ان کی نظر پڑی ہے اور ہر منظر کی انھوں نے عکاسی کی ہے۔ اب اس کو چاہے "ادب برائے زندگی" کہیے یا "زندگی برائے ادب"۔

ناؤ گاڑی پہ یا گاڑی ناؤ پر۔ بات ایک ہی ہے۔ زندگی میں کبھی یہ بھی ہوتا ہے اور وہ بھی۔

ویسے غالب کے کلام کی تو روز ہی بال کی کھال نکالی جایا کرتی ہے اور آج کل تو یہ فیشن سا بن گیا ہے۔ جس نے قلم ہاتھ میں لیا چلے مرزا غالب پر ہو گیا گھسیٹ مارا۔ لیکن "کار دنیا کسے تمام نکرد" والا قصہ ہے۔ انکشاف کا دروازہ بند ہونے والا نہیں۔ جب بھی اس جھروکے میں جھانکو "دامانِ باغبان و کفِ گل فروش" نظر آتا ہے۔ اور جب کبھی اس سمندر میں ڈبکی لگاؤ تو ایک آدھ موتی مل ہی جاتا ہے۔ اب یہی لیجئے ذرا سا مصرعہ ہے۔

"شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے"

بظاہر معمولی سا روزمرہ کا مصرعہ ہے۔ سیدھے سادے لفظ ہیں۔ لیکن جو خیال و تصور کے رسیا ہیں اور جن کے پاس قوت و عمل کا فقدان ہو، وہ اس کا شاعرانہ لطف اٹھائیں۔ مگر حرکت و عمل کے شیدائی کو تو ایک جہان معنی اس مصرعہ میں چھپا ہوا نظر آئے گا۔ مصرعہ کیا ہے "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِل کوزہ" ہے۔ بات سولہ آنے سچی ہے۔ آفرینش عالم کے وقت بھی درست تھی۔ آج بھی اتنی ہی سچی لگتی ہے۔ ایک طرف تو ان چند لفظوں میں طلب و آرزو کا طوفان چھپا ہوا ہے اور دوسری طرف "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق" والی بے باکی، رندی اور سرمستی بھی ہے۔

غالب فطرت کے رازداں تھے۔ ان کی نظر بھلا انسان کی ان دو عظیم انسانی صلاحیتوں پر کیسے نہ پڑتی۔ یہ صلاحیت شاید ودیعت ہی اس لئے کی گئی تھی کہ انسان موقع پر فرشتہ نہ بن سکے۔ اور اس کا شوقِ فضول دنیا کو "جنت نگاہ و فردوسِ گوش" بناتا ہے۔ اور شاید یہ منشائے قدرت یہ بھی ہو گا کہ جرأتِ رندانہ آپ اپنی موت کا سامان کرتی رہے اور فنا و بقا کا توازن قائم رہے۔

یہ واقعہ ہے کہ انسانیت کے خمیر میں اگر "شوقِ فضول" نہ ہوتا تو یہ دنیا آج بھی مٹی کا ٹیلہ یا دلدل ہی رہتی۔ اور بقول جوش۔ اب بھی پہاڑ، ندیاں ہو سکتی رہتیں۔ نہ یہ نظم و ترتیب ہوتی، نہ دلکشی و رعنائی، نہ یہ تنوع ہوتا نہ یہ بوالعجبی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ یہ انسان کا شوقِ فضول ہی تھا جس نے قوموں اور قبیلوں کو جنم دیا۔ سلطنتوں کی بنیاد رکھی۔ تہذیب و تمدن کا دھنک دوراہا بچھا۔ ذرے ذرے سے یگانگت پیدا کی۔ فطرت سے تال میل بڑھائی۔ "خیابان و گلزار و باغ" آراستہ کیے۔ پرستش و محبت کے نام پر نقش و نگار پتھروں پر ثبت کیے۔ اور کائنات کے ہر تار کو مضراب عقل سے چھیڑ کر نغمے پیدا کیے۔ غالب نے اپنے توہم پرست زمانے کو بہترا سمجھایا کہ ؎

بگذر ز سعادت و نحوست کہ ورا
تا دیدہ بہ غمزہ گشت و مریخ بہ قمر

لیکن وہ لوگ سعادت و نحوست کے چکر سے نہ نکلے اور اجرامِ فلکی سے مرعوب ہی رہے۔ یہ سعادت تو ہمارے اور آپ کے زمانے کی قسمت میں لکھی تھی۔ اس دور کے انسان کی جرأتِ رندانہ نے کائنات کے لبوں کو چھو لیا اور ماہ و مریخ سے چہلیں ہونے لگیں۔

پکی بات تو یہ ہے کہ صرف اسی شوقِ فضول نے انسان کو چوپاؤں سے بچا لیا اور حیوان کی سطح سے اونچا کر دیا۔

شوقِ فضول نہ ہوتا تو شعرا کے اشعار پھیکے اور حسینوں کی تحریریں بے مزہ، فلسفیوں کی کاوشیں نری حماقت بن جاتیں، وکیلوں کی وکالت ٹھپ، ایڈیٹر کے قلم کی روانی رک جاتی، عشرت گاہیں سونی اور رقص گاہیں ویران ہوتیں۔ اور بیچارے ٹوائیلٹ کے تاجر مکھیاں مارنے لگتے۔

غالب پرانے زمانے کے وضع دار آدمی تھے۔ ان دنوں ترقی پسندی کی لیبل داری کا دستور نہ تھا۔ نہ آج کل کی طرح ہر شخص پر لیبل لگایا جاتا تھا۔ نہ ہی کھری تحریریں کھلے بندوں بکتی تھیں اور ہر آدمی جنرل مرچنٹ ہو سکتا تھا۔ اس لئے غالب نیتا بن سکے، نہ کامریڈ۔ سیدھے سادے شاعر رہے۔

قوم کا درد، دنیا سنوارنے کی آرزو، اور وطن کی بربادی کا غم ان کے دل میں بھی تھا۔ لیکن کیا کرتے مجبور تھے۔ ہندوستان خیال تو اس زمانے میں لکھی جا سکتی تھی مگر کمپنی باغ میں تقریر نہیں ہو سکتی تھی۔ لے دے کر بس ایک ہتھیار ان کے پاس تھا کہ شعر کہہ ڈالو، اور جو چاہو اسی میں کہہ دو۔

اب نئے ادب ہی کو لے لیجئے۔ کس کثرت سے رات کی سیاہی اور صبح کے طلوع کا تذکرہ اس میں ملتا ہے۔ لیکن غالب پچھلی صدی میں اس دور کی خبر دے چکے تھے۔

"مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند • شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند"

بظاہر تو وہ "ساقی و مغنی و شراب و سرود" کے رسیا نظر آتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ نصیحت بھی کرتے جاتے ہیں۔

"زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند • حق را بسجودے و نبی را بدرودے"

کیا کیا جائے۔ عوام کا مذاق ہی ایسا تھا۔ جب کبھی وہ دعوت انبساط دیتے تھے کہ

"نشاطِ ... رنگ ساز ہا مست طرب • شیشہ سرو سبز جویبار نغمہ ہے"

تو خلقت سر دھنتی تھی، واہ واہ کا شور بلند ہوتا تھا لیکن جب ان کی نظر فلک کی رفتار پر پڑتی اور جھنجھلا کر خالص مارکسی انداز میں نوجوانوں کو للکارتے کہ

"بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم • قضا بگردشِ رطل گراں بگردانیم"

تو یہی کہتے، بڈھا دیوانہ ہو گیا ہے، اور عوام و خواص بول اٹھتے۔ پتہ نہیں کیا بکتے ہو! "ایسا کہا تم آپ سمجھو یا خدا سمجھے" اور غالب دل شکستہ و افسردہ ہو کر رہ جاتے۔

"نوائے کو سخن گسترانِ پیشینی • سپاس منکر غالب کہ در زمانۂ تست"

مرزا کی دوررس اور گہری نظروں نے حال اور مستقبل سب کچھ دیکھا۔ اور جب انگریزوں نے دلی کے باغوں میں اپنے ڈیرے ڈالے اور لال قلعہ پر اپنا پرچم لہرایا تو وہ ملیچھ افسوس کر کے رہ گئے۔ لیکن نہ جہاد کا دم تھا نہ ستیہ گرہ کرنا آتا تھا۔ چپکے سے اتنا کہہ کر رہ گئے۔

"بہ صبح بال فشاناں صبح گاہی را • ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم"

بہت سی بات تھی کہ بھیا یہ بلبلیں جا کر اپنے گھونسلوں میں رہیں، ہماری شاخوں اور پھولوں کو کیوں تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔

غالب کی حسرت ۹۰ سال بعد ان کے اہلیان وطن نے پوری کی اور ان "بال فشانانِ صبح گاہی" کو ان کے گھر واپس کر دیا۔

مرزا کی سیاسی سوجھ بوجھ بھی کچھ کم نہ تھی۔ ٹھیک وہی بات جو ان دنوں دیس کا ہر بڑا آدمی اور سیاست داں کہتا ہے، کتنے لطیف پیرایہ میں غالب کہتے ہیں:

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

ہماری زبان

۱۵ فروری ۱۹۶۲ء

غالب کی یاد میں

آج غالب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ترانوے سال ہو گئے۔ اس عرصے میں ادب کے اُفق پر کتنے ستارے چمکے اور غروب ہو گئے مگر غالب کی روشنی کم نہ ہوئی بلکہ آج پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

میر، سودا، نظیر، انیس، حالی، اقبال ہمارے بڑے شعرا ہیں، مگر غالب کی بات کچھ اور ہے۔ حالی کے الفاظ میں خسرو اور فیضی کے بعد ایسا جامع حیثیات آدمی ہماری سرزمین سے نہیں اُٹھا۔ غالب نے اُردو شاعری کو ایک نیا ذہن دیا۔ آدمی کو ایک نئی انسانیت دی۔ تشکیک کو ایک نیا مسلک ٹھیرایا۔ ارضیت میں ایک نئی ماورائیت پیدا کی۔ نفسیات کا ایک نیا باب کھولا، زبان سے ذہن کے ہر پیچ و خم کو ہموار کرنے کا کام لیا۔ الفاظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیا، معنی کو برگزیدگی کا ایک نیا راستہ دکھایا۔ آرایش خم کاکل کس نے نہیں دیکھی، مگر اندیشہ ہائے دور و دراز تک کون پہنچا۔ جنت کی حقیقت سب نے معلوم کرنے کی کوشش کی، اسے دل کو بہلانے کا ایک اچھا خیال کہہ کر شوخیِ گفتار کا ثبوت کس نے دیا۔ واقعہ سخت ہو جان کسے عزیز رہی، برق سے شمع ماتم خانہ کس نے روشن کی، دیر و حرم کو آئینۂ تکرارِ تمنا کس نے کہا۔ پھر نثر کے میدان میں مراسلے کو مکالمہ کس نے بنایا۔ معمولی سے حادثات اور روزمرہ کے واقعات میں افسانہ و افسوں کی دلکشی کس نے پیدا کی۔ خطوں کے ذریعہ سے باتیں کر کے خلوت کو انجمن کس نے بنایا۔ شوخی کو نکتہ سنجی کس نے سکھائی، زندگی کو ہزاروں مایوسیوں اور ناکامیوں کے باوجود اسی والہانہ انداز سے کس نے چاہا کہ داغِ حسرتِ دل کا شمار کرنا مشکل ہو گیا۔ وفاداری کو اصل ایمان کس نے سمجھا اور شیخ و برہمن کو ایک نظر سے کس نے دیکھا۔ عشق کو خللِ دماغ اور حسن کو ہمیں غازہ کہنے کا کسے حوصلہ تھا۔ اُردو شاعری کو بشریت کے آسمان تک کون لے گیا۔

اس غالب کا کلام اگر آج اُردو میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے، ہندی رسمِ خط میں لاکھوں آدمی اگر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ہندوستان کی دوسری زبانوں میں اگر اس کا ترجمہ ہو رہا ہے اور مغرب بھی اب اس سے آشنا ہو چلا ہے، تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ سب کیوں نہیں ہوا اور ابھی تک وہ سب کیوں نہ ہوا جس کا غالب حقیقی معنوں میں مستحق ہے۔

۱۹۶۹ء میں، یعنی سات سال کے بعد غالب کے انتقال کو سو سال ہو جائیں گے۔ دو سال ہوئے سب سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین نے دہلی یونیورسٹی کے یومِ غالب میں تقریر کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ۱۹۶۹ء میں سارے ملک میں اور اگر ہو سکے تو دوسرے ملکوں میں بھی بہت بڑے پیمانے پر غالب کی یاد میں جلسے کئے جائیں۔ ٹیگور کی یاد میں ۱۹۶۱ء میں جو جلسے ہوئے ہیں ان کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان کے ایک جلیل القدر فرزند اور چوٹی کے شاعر کی عظمت اور آشکار ہوئی، ہندوستان کی روح کو دنیا نے اور پہچانا۔ اسی طرح اگر غالب کی یاد منائی جائے تو نہ صرف یہ ایک اور چوٹی کے شاعر کا اعتراف ہوگا، نہ صرف اُردو ادب کی خدمت ہوگی، بلکہ ہندوستان کی روح کی گہرائیوں کا دنیا میں علم بڑھے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض اداروں میں غالب کے سلسلے میں کام کا نقشہ بن رہا ہے، کچھ ادیبوں نے بھی غالب پر تحقیق و تنقید کے خاکے تیار کئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مختلف افراد اور ادارے اپنے اپنے کام کے گوشے چن لیں اور کوئی ایک مرکزی کمیٹی ان سب کاموں میں ربط پیدا کرے۔ انجمن اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتی ہے، اس موقع پر ہم خاص طور سے پنڈت جواہر لال نہرو، پروفیسر ہمایوں کبیر اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مرکزی کمیٹی کے قیام میں دلچسپی لیں۔ غالب صرف اردو ادب کا سب سے بڑا شاعر ہی نہیں، وہ ہندوستان کے چوٹی کے شعرا میں سے ہے۔ اور اپنی فارسی شاعری کی وجہ سے پورے ایشیا کے لئے باعثِ فخر ہے۔ ہمیں اس کی یاد اس طرح منانی چاہیئے کہ جن قدروں کا غالب علمبردار تھا ان کے فروغ کی راہیں کھلیں اور اردو ادب کی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ ہندوستانی ادب کی رنگارنگی، گہرائی اور توانائی اور واضح ہو۔ غالب کی روح کا یہی تقاضا ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

اقبال کرشن

کچھ نادر مطبوعہ کتابیں

میرے ذاتی کتب خانے میں جو مطبوعہ کتابیں ہیں ان میں
سے کچھ ان کتابوں کا اجمالی ذکر ذیل میں درج کیا جا رہا ہے
جو اب کم یاب ہیں:

تقویم الغوثیہ: ۳۹۲ صفحات کی اس کتاب کا موضوع تصوف ہے سرورق غائب ہے اس لئے قیمت اور سنہ اشاعت کا پتہ نہیں چلا۔ "سبب تالیف کتاب" کے زیر عنوان یہ تحریر ہے کہ کتاب کی تالیف ۲۴ ربیع الاول ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) کو ختم ہوئی۔ "کتب خانہ لچھمن داس شمبو دیال تاجران کتب دریبہ کلاں، دہلی" کی شائع کردہ یہ کتاب بڑی ہی عجیب و غریب ہے: عجیب و غریب رازہائے سربستہ، عجیب از فہم تصویریں اور اشکال، کراماتی اشغال، معجزاتی اعمال اور ۵۲ ویں صفحے پر "حلیۂ عکس نقشۂ ازل تصویر احسن تقویم" کے عنوان سے ایک تصویر ہے یہ تین رنگی تصویر عمدہ آرٹ پیپر پر ہے، جو کسی خوبرو رعنا شہزادے کی ہے۔ کتاب کے مطابق تصویر شاہ جہاں کے کتب خانے سے لی گئی ہے۔ "شاہ گل حسن قلندر قادری" اس کے مصنف ہیں۔ اس سے پہلے ایک کتاب "تذکرہ غوثیہ" لکھ چکے تھے۔ عمدہ طباعت، اچھی کتابت، نفیس کاغذ بڑی تقطیع۔ پوری کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔

اسرار حقیقت: "محمد حافظ خاں تاجر کتب چوک لکھنؤ" کی شائع کردہ ۴۰۴ صفحات کی یہ کتاب بھی تصوف ہی سے متعلق ہے سنہ اشاعت ۱۳۳۰ھ ہے۔ بقول مصنف "سینے تک محدود رہنے والے رازوں کو اس کتاب میں پوشیدہ نہیں رکھا گیا ہے" سرورق اور پہلے دو صفحے غائب ہیں۔ پوری کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے: شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت۔ بڑی تقطیع اچھی کتابت، عمدہ طباعت، نفیس چکنا کاغذ۔ مصنف سید احمد خلق۔

کٹھ اپنشد: ۱۲۸ صفحوں کی یہ کتاب "ویدک پستکالیہ موہن لال روڈ لاہور" کی شائع کردہ ہے۔ سنہ اشاعت ۱۹۳۲ء ہے۔ کٹھ اپنشد کا یہ ترجمہ "شری سوامی درشنانند جی سرسوتی" کا کیا ہوا ہے۔ کتاب میں اصل متن بھی شامل ہے۔ مفید عام پریس لاہور کی مطبوعہ ہے۔

ایش اپنشد: ۴۸ صفحات کی یہ کتاب ایش اپنشد کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ اصل متن بھی شامل ہے۔ زیر نظر کتاب ۱۰۰۰ جلدوں کا پانچواں ایڈیشن ہے۔ قیمت تین آنے درج ہے۔

کین اپنشد: کین اپنشد کا اردو ترجمہ متن کے ساتھ۔ یہ کتاب بھی ۱۰۰۰ جلدوں کا پانچواں ایڈیشن ہے۔ قیمت تین آنے درج ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں مسلمانوں سے نوک جھونک بھی ہو گئی ہے۔

"اردو خواں اور مسلمان بھائی معلوم کر لیں کہ قرآنی تعلیم اور ویدک تعلیم میں کیا فرق ہے۔ اور ویدک تعلیم جس طرح خدا پرستی کا اپدیش کرتی ہے قرآنی تعلیم اس خیال تک جا ہی نہیں سکتی۔"

حسن اور صحت بڑھانے کے نسخے: ۵۰۰ نسخوں اور فارمولوں کی یہ کتاب کارخانہ پیسہ اخبار لاہور کی شائع کردہ ہے۔ شروع کے صفحات غائب ہیں اس لئے مصنف کا نام اور قیمت کا پتہ نہیں چل سکا۔ سنہ اشاعت ۱۹۲۲ء درج ہے۔

سانچ گنج: مؤلفہ منشی امجد حسین۔ مطبوعہ راجپوت پرنٹنگ ورکس لاہور۔ شائع کردہ کارخانہ جڑی بوٹی لاہور۔ سنہ اشاعت ۱۹۱۰ء ۹۶ صفحوں کی یہ ناول ۸ فصلوں پر مشتمل ہے۔ قیمت ۸ آنے۔

شاہزادہ جہانگیر: مصنفہ و مرتبہ "جناب منشی علی احمد خاں صاحب سہارنپوری مرحوم" "مطبوعہ مطبع کرشنہ طور لاہور" قیمت دو آنے۔ سنہ اشاعت ۱۳۲۰ھ۔ صفحات ۱۶۔

حسن بڑھانے کے طریقے: ۳۰ صفحات کی یہ بالتصویر کتاب منشی محمد دین صاحب نے کارخانہ پیسہ اخبار لاہور کے لئے لکھی تھی۔ رنگین سرورق۔ سنہ اشاعت ۱۹۲۳ء بار سوم۔ قیمت درج نہیں۔

خمخانۂ رام: مطبوعہ ابراہیم پریس۔ سنہ اشاعت ۱۹۲۰ء شائع کردہ شری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ لکھنؤ مرتبہ آر۔ ایس نارائن سوامی۔ صفحات ۳۴۰۔ زیر نظر کتاب کلیات رام کی جلد سوم ہے اس میں سوامی رام تیرتھ کی کچھ تقریریں ہیں۔ ۳۰ مضامین اردو کے ہیں اور دو مضامین ترجمہ ہیں۔ دو رنگا سرورق، عمدہ چھپائی، اچھا کاغذ، بہتر کتابت۔

کبیر جنم ساکھی: ۱۹۳۲ء کی مطبوعہ چھوٹی سی کتاب کبیر اور تلسی کی زندگی اور کلام سے متعلق ہے۔ مصنف منشی محمد خلیل انصاری۔ مطبوعہ شاہ جہانی پریس، دہلی۔

کام شاستر: یہ اس کتاب کا چھٹا ایڈیشن ہے جو دس ہزار چھپا تھا۔ سنہ اشاعت ۱۹۱۷ء ہے۔ کتاب دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپی تھی۔ مصنف دیو شاستری پنڈت "منی سنگھ گوردمدھ"۔ کتاب اشتہاری نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔

(باقی صفحہ ۷ پر)

نعیم حنفی

پرومے تھیئس[1]

میں نہیں فرزند کلا یمینۂ[2] و یوری میڈن[3]
میں نہیں خورزادگان طیطانیوں[5] کی قوم سے
رمز طالع سے واقف ہوں نہ انجم آشنا
میں ریاضی داں نہ علم طب سے ہمراز واسطہ
اور تعمیرات کے فن سے بھی کوئی مس نہیں
میں نہ ہمراز اتھینا[6] ہوں نہ غدار زئیس[7]
مجھ کو اولمپس[8] نہ اولمپس کی راہوں کا پتہ
میری آنکھوں نے کبھی دیکھی نہ ساق بادیاں
میں نے ساق بادیاں میں کب چھپایا تھا شرر
راز آتش جس پہ قائم ہے زئیس کا اقتدار
کب مری محدود معلومات میں شامل رہا
ضعف، بیماری، جنوں، رنج و محن، فسق و فجور
میں نے کب صندوقچے میں کرکے سربستہ پھر
اپنے بھائی ایپی میتھیس[9] کے ہاتھوں میں دیا
ہاں مگر وہ بجتی ہوئی مٹی کی زائیدہ بلا
سیم بر، زریں کمر، نا کتخدا، جوش بہار
وہ پنڈورا[10] وہ مجسم پیکر حرص و ہوس
میرے بیمار مزاج[11] کے سامنے لائی گئی
مرادہ کارگر پا کر گئی جب نامراد
میرے بھائی کو کیا اس نے اسیر دام زلف
اور اک دن کر دیا وا قہر کا صندوقچہ
آفتوں میں مبتلا اس دن سے ہیں کون و مکاں!

میں نہیں ہوں خطۂ یونان کا دانائے راز!
پھر مجھے کیوں درد کی چٹان سے باندھا گیا؟
کیوں مجھے تنہائی کے دشت کدے سونپے گئے؟
کیوں لپیٹے ہے مجھے زنجیر فکر روزگار؟
کیوں کلیجہ نوچتا ہے رات بھر غم کا عقاب؟
کیوں لب گویائی پہ ہے ثبت یہ مہر سکوت؟
تیرہا ہائے اولمپس نے کئے نازل عذاب
صرف اتنی بات پر، میں خود نگر خوددار ہوں
ہیں مری نوک زباں پر آتش حق کے شرر
اور شاخ دل پہ ہیں خوشنودی آدم کے پھول
مجھ کو بھی ساز نفس، سوز و گداز جاں ملا
لوگ مجھ کو طنز سے کہنے لگے پرومیتھیس
کاش یہ سچ ہو! پھلے ان خیرخواہوں کی زباں۔

1. Prometheus 2. Clomena 3. Eurymedor
4. [illegible] 5. Titans 6. Athena 7. Zeus
8. Olympus 9. Epimetheus 10. Pindora
11. Scythian Rock

دانش فرازی

وصال کے بعد

شب وصال کے بعد ایک رات آئی تھی
وہ رات جس تیرے جلووں سے ہم کنار ہوئی
وہ رات بھی تری زلفوں سے مشک بار ہوئی
حریف صبح چمن، رو کش بہار ہوئی
وہ رات بھی وہی کیفیت سرور رہی
مگر وہ رات تری زلف و رخ سے دور رہی
تری نظر کا فسوں تھا، تری نگاہ نہ تھی
تو ہر طرف تھا مگر تیری جلوہ گاہ نہ تھی
کہ تجھ سے جیسے کبھی کوئی رسم و راہ نہ تھی
جدا تیرے تکلم کا رس فضاؤں میں
مہک تھی تیرے بدن کی بسی ہواؤں میں
مگر کہیں ترے ہونے کا اعتبار نہ تھا
کہ کوئی تیرے سوا بھی تو جلوہ بار نہ تھا
سمجھ سکا نہیں وہ رات کیسے آئی تھی
کہ ہو بہو تری مانند مسکرائی تھی

زوار حسین انجم

قطعے

کاش شام غریباں کو سنور جانے دو | اور گیسوئے دلبر کو بکھر جانے دو
کم سے کم عصر کے بہار کا چرچا تو ہے | دھجیاں دامن یوسف کی بکھر جانے دو

رہ کے خاموش تماشائے وفا دیکھ لیا | سوچتا ہوں اب تصویر وفا میں تو لوں
دیکھ یہ سارا نہیں ... تو پھر شغل جنوں | خون میں اپنے نہا کر میں ذرا جھوم لوں

غزل

سرور ... شفیق

کبھی راہ کو بھلاؤ تو کچھ بات بنے | خار سے تلووں کو سہلاؤ تو کچھ بات بنے
کب سے ویران پڑی ہے مری کشت امید | بدلیو آکے برس جاؤ تو کچھ بات بنے
بڑی مدت سے ہے مرجھایا ہوا شوق کا پھول | دل کی دھڑکن میں سما جاؤ تو کچھ بات بنے
دل ہیں طفل، دل نہ، جنوں کا قائل | تم بھی آکر اسے سمجھاؤ تو کچھ بات بنے

فرحت القادری

جھلکی صبح اٹھتی دھوپ دھندلی شام سے گذرے
غرض یہ ہے کہ ہم ہر گردش ایام سے گذرے
کہیں مجنوں کہیں عارف کہیں شاعر کہیں ...
تمہارے چاہنے والے بھی کس کس نام سے گذرے
سہارا بن گیا ہر موڑ پر حسن تصور ہی!
نہ جانے وسوسے کتنے دل ناکام سے گذرے
نگاہیں تو اٹھیں لیکن کسی نے ...
وہ ... فرحت ... جام سے گذرے

مراسلات

اُردو مجلس، حیدرآباد

۲۲ جنوری کا "ہماری زبان" اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ اس کے صفحہ ۴ پر "انجمن کا خبرنامہ" کے زیر عنوان انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کی طرف سے "آندھرا پردیش اُردو کانفرنس" (منعقدہ دسمبر ۱۹۶۱ء) میں سنائی ہوئی رپورٹ شائع کی گئی ہے جس میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی گذشتہ گیارہ سالہ کارگزاری کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ رپورٹ جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن نے سنائی تھی۔

میں یہاں متذکرہ صدر رپورٹ کے صرف اس حصے کی تردید کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے حیدرآباد کی ایک ادبی انجمن "اُردو مجلس" کو "انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کا ایک اہم شعبہ" قرار دیتے ہوئے "اس (اردو مجلس) کی ادبی سرگرمیوں کو انجمن ترقی اردو کی ادبی مصروفیات میں شامل فرمالیا ہے۔

"ہماری زبان" کے قارئین کے علم و اطلاع کے لئے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اُردو مجلس انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کا شعبہ نہیں بلکہ ایک علیحدہ ادبی انجمن ہے۔ اسے اُردو کے مشہور مزاح نگار ادیب، مرزا فرحت اللہ بیگ نے ۱۹۳۴ء میں قائم فرمایا تھا۔ پہلے پہل اس کے چند ماہانہ جلسے خود مرزا صاحب مرحوم کے دولت خانہ (واقع برکت پورہ) اور پھر باری باری سے اراکین اُردو مجلس کے گھروں پر منعقد ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ناظر یار جنگ کے دولت خانہ پر اور علی گڑھ کلب میں منعقدہ اس کے بعض اجلاسوں میں تو "یکے از سامعین" کی حیثیت سے شرکت کا مجھے بھی شرف حاصل ہوا ہے۔

حیدرآباد میں انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کی طرف سے اُردو ہال کی تعمیر کے بعد اُردو مجلس کے ماہانہ اجلاس اُردو ہال میں منعقد ہونے لگے۔ اُردو مجلس کے ان اجلاسوں میں پابندی سے شریک ہونے والے حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس ادبی انجمن کی ایک علیحدہ مجلس انتظامی بھی ہے اور کم و بیش چار سال سے آندھرا پردیش کے مشہور، لائق احترام اور نیک نہاد انسان اور ہماری زبان اُردو کے خاموش خدمت گزار راجہ جانکی پرشاد صاحب اس کے صدر کی حیثیت سے کارگزار ہیں۔ مجلس انتظامی کے دیگر اہم اراکین اور عہدہ داروں میں بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہر جوشیات ڈاکٹر غلام یزدانی، مشہور ماہر تعلیم جناب سجاد مرزا، جناب سید محمد یونس، جناب حسیب الرحمٰن اور محترمہ بیگم حبیب الرحمٰن شامل ہیں۔

(محمد منظور احمد معتمد اعزازی اُردو مجلس حیدرآباد (آندھرا پردیش)

(ہماری زبان)

متذکرہ بالا مراسلے میں حبیب الرحمٰن صاحب کی رپورٹ کے جس حصے کی "تردید" کی گئی ہے وہ یہ ہے:

"..... ہماری جد وجہد کا ایک اور اہم شعبہ "اُردو مجلس" ہے جسے انجمن ہی کے کارکن بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں..... انجمن کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز ہے....."

مراسلہ نگار نے جن حضرات کو اردو مجلس کا کار دھر قرار دیا ہے وہ سبھی لوگ انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے کارکن اور سچ پوچھئے تو روح رواں بھی ہیں۔ مستثنیٰ صرف راجہ جانکی پرشاد صاحب ہیں۔ سجاد مرزا صاحب، غلام یزدانی صاحب اور خود حبیب الرحمٰن صاحب تو انجمن کے عہدیدار ہیں۔ حبیب الرحمٰن صاحب کی غلطی بس یہ ہے کہ وہ اُردو مجلس کو انجمن ہی کے کارکن بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

آصف سلور جوبلی

ہر ملک، ہر قوم، ہر حکومت کا دستور ہی نہیں فرض ہوا کرتا ہے کہ اپنے ادبا، شعرا کو سینے سے لگا کر رکھے۔ ان کے علم و فضل کی قیمت تو ادا نہیں ہو سکتی لیکن ان کے علمی ادبی کارناموں کی قدر کرے۔

بھوپال کے اُردو ادیبوں کی کس مپرسی اور پریشاں حالی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اور سماج کی ناقدر دانی سے دل پر دھکا لگتا ہے۔ ایسی صورت میں اردو ادیبوں کا زندہ رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر ہم نے اپنے ترقی پسند ادیب صحافی آصف صاحب شاہمیری جو گذشتہ ۲۵ سالوں سے بے لوث سیاسی، سماجی اور ادبی خدمت کرنے میں بارہا جیل کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے ہیں۔ کالج جو اردو کے مطالبہ سے لے کر قبرستان کے تحفظ تک، لائبریریوں کی قائمی، اخبارات کا اجراء اور ہر مجبور، مزدوروں کی بھلائی کے لئے جو بھی کام کرتے رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ جب بھی اہل وطن نے جو چاہا ہمارے سوشل ورکر نے کر دکھایا۔ ایسے مخلص کی سلور جوبلی منانے اور ان کی سات کتابوں کو شائع کرنے کے لیے گیارہ ہزار سات سو ایک روپیہ جمع کرنا ہماری بیداری کا ضامن ہوگا۔

ہم تمام اہل قلم، برادران وطن سے اپیل کرتے ہیں کہ دامے، درمے، سخنے اور قدمے تعاون فرما کر ہماری نیک خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔

(دستخط) محمد یوسف قیصر، افسر عزیز (ناظم)، کامتا پرشاد (سابق وزیر خزانہ)، آغا جلال الدین (بہادر)، حمید قریشی (صدر نگر کانگریس)، کامریڈ مستھرا بابو (کمیونسٹ رہنما)، کے۔ این۔ پردھان (پی۔ ایس۔ پی)، یوسف قریشی (پی۔ ایس۔ پی)، ست نرائن مستر یواستو (جاگرن)، ایم۔ عرفان (جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو) اور دیگر حضرات۔

سیہور، آشٹہ، راشین، اودے پورا، اور راجہ کے سوشل ورکرس سلور جوبلی فنڈ کی رقومات مندرجہ ذیل اصحاب کو ارسال فرمائیں۔

حاجی محمد حسین ڈی لکس چوک۔ شیر جہانی بھوپال اسٹیشنری مارٹ چوک، شہریار سیما پریس بدھواڑہ اور سید ریاض الدین احمد ابراہیم پورہ

"کان پکڑی لونڈی؟"

مجلۂ اردو ادب شمارہ ۲-۱ ۱۹۶۱ء میں جناب میکش اکبرآبادی نے اپنے مقالہ بعنوان "فانی بدایونی" میں صفحہ ۶۹ پر مولوی سید انوار الرحمٰن صاحب بسمل جے پوری کے تعارف میں ایک محاورہ "کان پکڑی چھیلی" تحریر فرمایا ہے۔ یہ محاورہ اُردو لغت میں کان پکڑی لونڈی یا باندی درج ہے اور عام بول چال میں کان پکڑی چھیری استعمال ہوتا ہے یعنی مسکین طبع آدمی کو سیدھی سادھی چھیری (بکری) سے مناسبت دی جاتی ہے۔ کان پکڑی چھیلی ابھی تک سننے میں نہیں آیا۔ اس سے مراد کان پکڑی لونڈی باندی ہے۔ یا کان پکڑی بکری؟

امید ہے کہ جناب میکش اکبرآبادی اس محاورے کی توضیح کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔

(خاور جبل پوری)

بقیہ

کچھ نادر مطبوعہ کتابیں

۹۶ صفحات کی اس کتاب کے آخر میں حسب ذیل ایسے اخبارو کے حوالے درج ہیں جنھوں نے دواخانے کی تعریف کی تھی۔

افغان (پشاور)، سناتن دھرم پرچارک (امرت سر)، مخبر عالم (مراد آباد)، شاہد سخن (حیدر آباد دکن)، کان پور گزٹ (کان پور)، ست اپدیش (لاہور)، مساوات (الہ آباد)، حق پسند (امرت سر)، راجپوتانہ گزٹ (اجمیر)، کوئٹہ نیوز (کوئٹہ)، رسالہ مرقع (شاہ جہاں پور)، مدینہ (بجنور)، رسالہ فیاض (بلال پور)، الحامی (مدراس)، اتحاد روزانہ (بمبئی)، شانتی (راولپنڈی)، رسالہ بیداری (بہرائچ)، رفیق الاساتذہ (مدراس)، پنجاب سماچار (لاہور)، براہمن گزٹ (راولپنڈی)، اخبار عام (لاہور)، الناظر (لکھنؤ)، دیہ بسکردی (رام پور)، مفید روزگار (بمبئی)

آئینۂ عبرت: صفحات ۲۴۰۔ مطبوعہ جید برقی پریس، دہلی شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔ مصنفہ اختر بانو سہروردیہ سنہ اشاعت ۱۹۳۴ء۔ تیسرے ایڈیشن والا۔ ناول ہنری وڈ کے کسی اخلاقی ناول کا آزاد ترجمہ ہے۔

رہنمائے بایوکیمسٹری: ۹۶ صفحات کی یہ چھوٹی سی کتاب بایوکیمک علاج سے متعلق ہے۔ نہ مترجم کا نام ہے نہ قیمت درج اور نہ سنہ اشاعت ہے۔ سر ورق پر صرف "کے۔ دیج" تحریر ہے مطبوعہ علاوالدین برقی پریس دہلی۔

انتخاب حبیب: شائع کردہ میکملن اینڈ کمپنی سنہ اشاعت ۱۹۲۰ء مختلف حضرات کے مضامین کا مجموعہ۔ ایک نصابی کتاب۔ عمدہ آرٹ پیپر پر نفیس طباعت۔ ۲۴۰ صفحات کی مجلد کتاب۔

اردو انگریزی لغت (The 20th century urdu English Dictionary): یہ جیندر ناتھ سین صاحب کا مرتبہ لغت ہے۔ سنہ اشاعت ۱۹۱۱ء۔ مرتب نے اپنا لغت ڈاکٹر ڈنکن فوربس کی مشہور ڈکشنری کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ ضخامت ۹۰۶ صفحات چونکہ کتاب پرانی دکان سے خریدی گئی ہے اس لئے قیمت درج نہیں اس لغت میں سنسکرت الفاظ اس کثرت سے ہیں کہ اس پر سنسکرت لغت کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ہر لفظ کا تلفظ رومن رسم خط میں ظاہر کیا گیا ہے۔

رائے محبوب نارائن

اُردو رسم خط اور اُس کی فکرِ اصلاح

دنیا کے ہر رسم خط کے پیچھے اس کے اپنے تمدن کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اور ہر رسم خط کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ ہر زبان کا رسم خط ہونا کوئی ضروری نہیں۔ برخلاف اس کے اُردو بھی اپنے تاریخی رونیداد کے ساتھ ابتدائی دور میں زبان تو نہیں مگر خط ضرور رہا ہے۔ یورپ کی سب زبانوں کا خط لگ بھگ یکساں ہے۔ مگر ہمارے دیس کے ہر پردیش کی بولی الگ اور بول کے ڈھنگ الگ خط جدا۔ خط، کے وصل فصل جُدا۔ ہندوستانی زبانیں اپنی داخلی ساخت اور پرداخت کے نظر کرتے ہیں ہیلین آریائی، دراوڑی اور سمیٹک کھمبوں کا سہارا لئے کر منڈھوے چڑھی ہیں مگر خط کے اعتبار سے یہ سب برہمی لپی کے آدھار پر پروان چڑھی ہیں۔

اس رنگا رنگ منچ پر دستور ہند نے مرکزی زبان ہندی کو مان لیا تو سیاسی مقاصد نے ہماری اُردو کو کانٹوں میں کھینچا بدیشی گوروں کے کالے رفیق ہندی، اُردو ہندوستانی کے بکھیڑوں کو ملک میں کھڑا کر دیا اور درمیانی زاویوں کو اتنا وسیع کر دیا کہ اب ان کی سمتیں مختلف ہوتی نظر آتی ہیں۔ جنی کہ ہمارے ہی گھر میں ہماری منزلیں الگ الگ متعین ہونے کو ہیں۔ مگر ایک ایک دن یہ گل ضرور ہی کِھل کر رہے گا۔ اور سیاسی طوفان کے تھمتے ہی پرامن سکون میں ہم یہ محسوس کریں گے کہ واقعی ہم کس قدر بھٹکتے رہے ہیں۔

اُردو لپی کی داستان قصہ در قصہ ہے اس نے خمیر اور جوہم کوفی اور کوفی سے نسخ و نستعلیق تک کوئی (۲۲) رنگ بدلے۔ اس کے اسباب بہت ہیں تاہم دو چار کا ذکر یہ ہے۔

(۱) تحریر کے لئے جو مواد میسر آیا طرز تحریر پر اثر انداز ہوا مثلاً درختوں کی چھال جانوروں کی کھال۔ جھلی اور ہڈیاں۔ تاڑ کے پتے، بھوج پتر، لکڑی کی تختیاں۔ پتھر دھات۔ کپڑا۔ کاغذ جس پر لکھا جاتا یا جس سے لکھا جاتا۔ یعنی ڈنڈی، لوہے کے کیلئے، پر و بد نال۔ پر و بال وغیرہ یا خون، پتوں کا رس، شنجرف، نیلا تھوتہ، کالک، روشنائی کے کام آئے۔ کس پر لکھا جاتا یا کس سے لکھا جاتا کے سوا کون لکھتا تھا اور کیوں لکھتا تھا اور کس کے لئے لکھتا تھا؟ یہی اس گتھی کے سلجھانے میں مدد کرتے ہیں۔ کہیں کاتب کا مذہب اور مختلف مکاتب خیال نے اپنی تعاینت کی خاطر نقوش کی تحریف کی۔ طغرا بنائے اور کبھی تخت و تاج کی کج کلاہی نے اپنی شان علوس کے لئے حروف کو ترچھا ترپایا۔ یہی وہ سب اسباب ہیں جو حروف تحریر کے مختلف اشکال کا سبب بن گئے۔ اس طرح یہ لین ہاتھ آئی کہ اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت کی صلاحیت اُردو خط کی بقا و ارتقا کی ضامن ہے۔ اب وقت کا تقاضہ کیا ہے۔ بدلے ہوئے حالات ہر جگہ یہ مشینوں کا دور ہے اُردو خط میں کہاں تک یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ ہم مہذب قوموں کے دوش بدوش اپنے خط کو زندہ رکھیں۔

اُردو خط میں کیا وہ افادیت باقی ہے کہ زمانہ کے تقاضوں اور ضروریات کو پورا کر سکے تو پھر ہماری ضرورت کیا ہے۔ اس کا حل کیا ہے۔ اردو خط کی افادیت کا معیار و اصول کیا ہونا چاہئے۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ ہماری ضرورت کتابوں کی مانگ ہے تاکہ حصول علم کے باب میں زیادہ سے زیادہ افراد زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔ اس بڑھتی ہوئی مانگ کو خطاط، کاتب اور محرر پورا نہیں کر سکتے۔ اس لئے خود کار مطابع اور ٹائپ رائٹر ناگزیر ہیں کہ کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ کتابیں شائع ہوں۔ اب خط کی افادیت کا معیار یہ قرار پاتا ہے کہ جلد اور آسانی سے اچھا لکھا جائے اور تیزی سے صحیح پڑھا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ کم محنت، کم وقت اور کم سرمایہ لگے۔ کفایت شعاری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اشاعت تعلیم اور طباعت سے ان اغراض کو پورا کرنے کے لئے ہم معلوم کریں کہ اُردو خط میں خامیاں کیا ہیں اور ان نقائص کو دور کرنے کے لئے ارباب فکر کو کیا کرنا چاہئے۔

(۱) اُردو خط میں حروف صرف چند نقطوں سے ممیز ہوتے ہیں۔ اشکال یکساں ہیں۔

(۲) لفظ کی ساخت میں حرف سر لفظ اور قلب لفظ میں اپنے پایہ لفظ سے جدا نقش رکھتا ہے۔

(۳) ایک آواز کے لئے کئی شکلیں ہیں۔

(۴) کرسی حرف اور لفظ کے جوڑ مستطیل نہیں۔ قلم کا اتار چڑھاؤ پیچ اور خم میکانی طریق کے لئے دشوار و ناموزوں ہے۔

(۵) تمام اصوات کے لئے اشکال موجود نہیں۔

(۶) حروف کے نام ان کی آواز پر راست دلالت نہیں کرتے۔

جب ہم ان اعتراضات پر غور کرتے ہیں تو اردو خط کی تبدیلی سے متعلق ہم میں اس وقت کم از کم چار مکاتب خیال پائے جاتے ہیں۔

(۱) پہلا گروہ کہتا ہے کہ اُردو خط میں ناقابل اصلاح نقائص ہیں اس کو رومن سے بدلا جائے۔

(۲) دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ اس خط کو صوتی عناصر کے اعتبار سے ہندی سے بدلا جائے۔

(۳) تیسری جماعت چاہتی ہے کہ کوئی خط نقائص سے خالی نہیں اس لئے موجودہ خط کے بدلے ایک نیا خط ایجاد کیا جائے تو زمانہ کی ضرورت پوری ہو سکے گی۔ صوت نگاری، تصویری خوبی، زود نویسی اور تیز خواندگی کی اہمیت طوالت کا رستہ بھی بچاتا ہے۔ اختصار، کفایت وقت و سرمایہ و محنت اس کے اہم عناصر ہیں۔ نیز عنصری ساخت اور داخلی صلاحیت کا لحاظ کرکے مشین کی ایجاد و اختراع کے لئے ہر طرح موزوں ہو۔ یہ مسئلہ خط کی تبدیلی سے زیادہ موجدین اور صناعوں کو دعوت فکر دیتا ہے۔

پہلے اور دوسرے گروہ کی نوعیت عند یکساں ہے۔ یہ سیاسی گٹ بندیوں کا پرتو ہے یا پھر تنگ نظری ہے۔ ہم انگریزی زبان میں چار وضع کے رسم خط بیک وقت استعمال کرتے ہیں مگر یہ محسوس تک نہیں کرتے کہ ان میں کہاں یک جہتی ہے اور کہاں اجنبیت؟ کیا یورپ والوں نے پریس اور ٹائپ رائٹر کی خاطر اپنی لکھت کو بدل ڈالا؟ چین کے خطوط اشارہ نے رومن حروف کو مٹا دیا؟ برناڈ شاہ کی انجمن نے یورپ میں

ہو قدم اٹھائے گئے ہیں بھی صحیح پڑے۔ سر ولیم جونس نے ہندوستانی زبانوں کے لئے جو رومن خط مدون کیا تھا گیا چل پڑا؟ اس باب میں گرجا گھر کے پادریوں کی کوششیں یورو پین لوگوں کو جو رومن خط سے ہٹ کر کوئی دوسرا خط پڑھ ہی نہیں سکتے تھے یا مغربی ادبا علم وفضل ہماری زبان کو صحت تلفظ سے ادا نہیں کر سکتے تھے یا پھر فوجی کمانڈروں کے سوا کسی اور کے کام نہ آسکا۔ چین میں جس کا رسم خط ایک گورکھ دھندا ہے یا پھر ترکی میں مشرقی خط کی بجائے رومن خط کو جبراً رواج دینے کی کوشش ہے۔ یہ بات تو بالکل غلط ہے کہ کوئی زبان، دوسری زبان کا رسم خط لے کر کام چلائے۔ ماضی میں ادائی مفہوم کے لئے اور بھی خط تھے۔ جیسے مصریوں کا تصویری خط یا ایرانیوں کا میخائی خط مگر اب یہ نمائش اور عجائب خانے کے سوا کہیں نہیں پائے جاتے۔ ہندوستان سے سنسکرت، پالی، اودھی، مگدھی، برج بھاشا، دری، عربی فارسی سب چل بسے۔ ان میں سے کوئی بھی اب کسی ایک گھرانے میں بھی بولی نہیں جاتی۔ سنسکرت کے پاس کیا رسم خط تھا۔ اس باب میں ابھی کام تحقیق طلب ہے۔ البتہ اردو پر عربی کا پرتو ہے۔ چودہ سو سال قبل عرب کے پاس عبرانی خط تھا۔ اسلام بت پرستی کے خلاف جہاد ہے اس لئے ان تصویری نقوش میں قرآن لکھنے کی ممانعت کی گئی۔ خلفاء کے زمانے میں احمد بصری نے حروف مروجہ کو منقطع کیا۔ تصویری باقی نہ رہی تو حروف نے پرستش کے تصور سے پاک ہو کر خط کی شکل اختیار کرلی۔ ہر حرف کو ملا کر لفظ لکھنے میں اس انقلاب سے خط کا ایک ضابطہ درکار تھا جو صرف نحو "اردو" میں مدون ہوا یعنی ب کو الف سے ملا کر لکھا جاسکتا مگر الف اور ب جدا جدا لکھے جاتے۔ اسی طرح ر و د بھی اس قاعدے میں تھے اور اردو خط مروج ہوگیا۔ اردو رسم خط کی تبدیلی سے متعلق جو اقدام پچھلی دو صدیوں میں کئے گئے وہ سب تحریکیں گاؤ خورد ہوگئیں۔ کوئی پلہ بھی کامیاب نہ ہوسکا تو پھر اس آزمودہ تجربہ کو تازہ کرکے آزمانا کیا ہے۔

اگر اس کو مان لیا جائے تو ہمارا سارا اثاثہ علم و سرمایہ ادب میخائی حروفوں کی طرح آثار قدیمہ کے نشانات ہو کر عجائب خانے کی زینت ہوجائے گا۔ جو اعتراضات اردو خط پر کئے گئے ہیں وہ سب بلا کم و کاست، ہندی اور رومن پر بھی عاید ہوتے ہیں۔ مثلاً اردو کے تمام تلفظ دوسری آوازوں کو ادا کرنے سے ناگری اور رومن حروف بھی قاصر ہیں اور ان کی اصلاح اور ترمیم بھی نیا درد سر ہے۔ مثلاً क کے نیچے نقطہ لگا کر ق اور ज کے نیچے نقطہ لگا کر ز، ذ، ض، ظ بنا بھی لیا گیا تو تنہا اور کو ملو کے ہائے مخلوط کو کس طرح لکھا جائے گا پھر ہمزہ اور و کے لئے کیا لکھا جائے۔ دکھلاوا، بھلاوا۔

ناگری (۳۷) حروف صحیحہ (۱۶) حروف علت اور (۱۲) ماترے کو ملا کر (۶۹) نقوش ث ح خ ذ ز ض ظ ع غ ف ق کے لئے (۱۲) نقوش اور ایجاد کیجئے تو (۸۱) اشکال ہوگئے ان ہم تلفظ اشکال کو دور گذر کرکے ایک شکل سے کام لیا گیا تو بس قصہ ہی ختم ہوگیا۔ اصرار، اسرار کے باہمی معنی کے فرق سے ہم محروم ہو جائیں گے۔ یہ نقص رومن خط میں بھی اسی طرح ہے nature اپنی آواز chen کی دیتا ہے تو دونوں کے الگ الگ ڈھنگ کا ڈھونگ کیوں۔ انگریزی a, e, i, o, u کے لئے کوئی خاص آواز مخصوص نہیں یہ پانچ حروف (۱۶) آوازوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں تو اردو کیا بری ہے۔ ہم تو غلط نویسند و صحیح بخوانند کے مصداق ہیں۔

ہندی حروف زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہیں بالخصوص جگت حرف، پلستہ جی کے موقع پر مرکب شکل اور زیادہ پیچیدہ ہوجاتی ہے۔ اس کی ماترائیں آگے پیچھے، بغل میں، نیچے، اوپر، رسیدی ترچھی، ٹیڑھی کئی طرح سے دی جاتی ہیں۔ ان کے لئے دیوناگری کی پابندیوں کا خواہ کتنا ہی جواز تلاش کریجئے مگر پیچیدگی جوں کی توں باقی رہے گی۔ مرزا۔ پرچار کرنا اور اہرا میں ہر وقت عجیب شان سے لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح رومن میں but اور put میں u کی آواز اور nose اور come میں o کا عالم ظاہر ہے یہ سنی سنائی پر ایمان لاتا ہے۔ جب رومن خط کی افتاد ہی یہ ہو تو یہ اردو کی ناز برداری کیونکر کرسکے گا۔ ا اور ع کے لئے a۔ ت، ٹ اور ط کے لئے t۔ د، ڈ کے لئے d۔ ث، س اور ص کے لئے s۔ ذ، ز، ض، ظ کے لئے z۔ ح اور ہ کے لئے h۔ اس کے بعد چ کے لئے ch اور غ کے لئے gh۔ جبکہ اس کی آواز حلق و دہن سے صرف ہوا کا اخراج ہے تو آپ کیونکر پڑھ سکو گے۔ غرض یہ دشواریاں اپنی جگہ جوں کی توں ہیں۔ اردو اور ناگری کی نسبت (۴۳) اور (۱۵۰) کی ہوتی ہے۔ یعنی ایک مضمون کو اردو (۴۳) سطروں میں لکھتا ہے تو ناگری کے لئے (۱۵۰) سطریں درکار ہوں گی۔ رومن میں یہ نسبت (۵۰) اور (۱۶۰) کی ہے اعراب کی بجائے حرف درکار ہوں گے۔ یہ تناسب مکان اور زمان دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی لکھنے کے وقت پر بھی اور صفحے کے رقبہ پر بھی۔ اردو خط ناگری سے دگنی تیزی سے پڑھا جاتا ہے اور رومن میں اردو تین سطریں پڑھنے تک دو سطریں ہی پڑھی جاسکیں گی۔ نظر اور فہم دونوں کا ربط تیزی سے باقی نہیں رہ سکے گا۔ یہ دو زبانوں کے جاننے والے ماہرین کا تجربہ ہے۔ کمپوزنگ میں بھی یہی ہوگا۔ بلکہ کمپوزنگ میں کئی پائنٹس اور کئی پوائنٹس کے ٹکڑے دینے ہوں گے۔ غرض جو نقائص مطبع کے ناطے اردو خط میں گنائی گئیں وہ خط سے زیادہ خود مطبع کے نقائص ہیں۔ اردو پریس بلاشبہ بری حالت میں ہیں اور جدید ترین آلات طباعت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ تو اس کی ذمہ داری اردو خط پر نہیں بلکہ ہماری توجہ اصلاح مطبع کی طرف کم ہے۔ اس خصوص میں ہم کو مصر اور ایران سے سبق لینا چاہیے ناگری کے خط شکستہ کا چلن کا دور ہی۔ مارواڑی اور گجراتی کی طرف اس قدر زیادہ ہے کہ ایک دن خود ناگری اردو رسم خط کی طرف مائل ہوگی۔

(۳) اردو خط میں ہر طرح کی صلاحیت اور لچک موجود ہے بلکہ یہ دنیا کا بہترین خط ہے اس میں مزید کسی قسم کی تبدیلی غیر ضروری اور عبث ہے۔ رہے دو ہی خالہ بے طرح اللہ دراہی بھلا۔

بقیہ

مرزا غالب ـــ گپ شپ

بجنگ باج ستانان شاخسارے را
تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

یعنی یہ بین الاقوامی لوٹ کھسوٹ کرنے والے جو لاؤ لشکر تمہارے باغوں کو تاراج کرنے آتے ہیں، انھیں دروازہ ہی سے خالی ہاتھ لوٹنے پر مجبور کر دو۔

لیکن یہ سب کچھ کہ کر جب اہالیانِ محفل کے تیور دیکھتے۔ تو معذرت کرنے لگتے اور بذلہ سنجی میں پناہ ڈھونڈتے۔

"بادہ اگر بود حرام بذلہ خلاف شرع نیست
دل نہ تہی بخوب ما طعنہ مزن بزرشت ما"

غالب مومن کی طرح جوتشی نہیں تھے۔ لیکن غضب کے نباض شناس تھے۔ آدمی کی طوفان خیز صلاحیتوں کو دیکھ کر انھوں نے کہا، ؎

"ما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکے انساں شد"

لیکن مرزا کے فرشتوں کو بھی خیال نہ ہوگا۔ کہ کبھی انسانیت کے تیور اتنے تیکھے اور انداز اتنے بھیانک بھی ہو سکتے ہیں کہ حسن و عشق اور رنگ و نور سب پناہ مانگیں گے۔

بہرحال غالب نے فارسی میں بھی خوب خوب جولانیٔ طبع دکھائی ہے بس۔ فارسی دیوان کی یہ بدنصیبی رہی کہ اسے کوئی عبدالرحمٰن بجنوری نہیں ملا اور اتنی خوش قسمتی بھی کہ اسے ڈاکٹر عبداللطیف سے سابقہ نہیں پڑا حالانکہ شاعر نہ کسی کے لئے کچھ کہتا ہے۔ نہ کسی وجہ سے کہتا ہے۔ اس کا شوق اس کا جنون اور اس کا عشق اسے جدھر لے جاتا ہے۔ جو کہلواتا ہے کہتا ہے۔ غالب نے خود اقرار کیا ہے۔

زمام ناقہ بدست تصرف شوق است
بسوئے قیس گر آید ز ساربان نبود



انجمن ترقی اُردو دہلی کا

دہلی کارپوریشن سے مطالبہ

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو شاخ دلّی نے ۲۴ر اکتوبر کو ایک خط میئر کارپوریشن کو لکھا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ الیکشن کے لئے جو لٹریچر چھاپا جائے وہ اُردو میں بھی ہونا چاہیے جس کے جواب میں الیکشن افسر نے مطلع کیا کہ ووٹر لسٹیں اور لٹریچر اُردو میں بھی چھپوایا گیا ہے۔ جنرل سکریٹری نے ایک اور خط لکھا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ جلوس کو دعوت نامے اُردو میں بھی بھیجے جانے چاہئیں کیونکہ دلّی کی علاقائی زبان اُردو ہے۔ آئندہ بھیجے جانے والے دعوت ناموں میں اُردو کو بھی شامل کیا جائے۔ ایک اور خط میں بیلٹ پیپر کو ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو میں چھاپنے کے لئے کہا گیا ہے۔

سوویت ہندی ثقافتی معاہدہ

۳ر فروری کو کلکتے میں سوویت یونین اور ہندوستان کے درمیان ثقافتی اور سائنسی تبادلے کے منصوبے پر دستخط ہوگئے اس دستخط کی تقریب میں ہمایوں کبیر صاحب نے تقریر کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی کہ ثقافت، سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ہند سوویت تعاون کی بدولت جو کہ سال بہ سال بڑھ رہا ہے ہندوستان اور سوویت یونین کے درمیان دوستی کے رشتے اور مضبوط ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان اور سوویت یونین کی دوستی پُرامن بقائے باہم کی ایک شاندار مثال ہے۔

اس معاہدے کے بعد سوویت یونین اور ہندوستان کے درمیان ثقافتی اور سائنسی تبادلے میں اضافے کی گنجائش پیدا ہوئی ہے۔ اب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں اور سائنس دانوں کے تبادلے ہی اور ادیبوں، موسیقاروں اور فلمی کارکنوں کے وفود کے تبادلے ہو سکیں گے۔ اس میں صحت اور تعلیم کے شعبوں کے کارکنوں کا تبادلہ بھی شامل ہے۔ یہ معاہدہ ۱۹۶۲ء۔۱۹۶۳ء کے لئے ہوا ہے۔

لسانی جھگڑے اور صوبہ پرستی

چین اور پاکستان سے بڑے خطرے

کان پور۔ ۲۷ر جنوری۔ صدر کانگریس مسٹر سنجیوا ریڈی نے دورا، راج پور، اور یا میں انتخابی جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے عوام کو لسانی جھگڑوں اور صوبہ پرستی کے خلاف انتباہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں باتیں چین اور پاکستان سے بڑا خطرہ ہیں۔ انھوں نے عوام سے کہا کہ ہندی کو سرکاری زبان بنانے میں جو وقت لگ رہا ہے اس سے بے چین نہ ہوں۔ کیونکہ غیر ہندی علاقوں کے رہنے والے جلد ہی اس زبان میں کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ڈپلومہ ان اسپوکن اُردو

مرکز ادب اُردو کالج کلکتہ کے زیر اہتمام "ڈپلومہ ان اسپوکن اُردو" کا امتحان آئندہ ۱۵ر مارچ سے ہوگا۔ فیس اور فارم ۱۵ر فروری تک وصول کئے جائیں گے۔ تاخیر کے ساتھ فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ ۲۰ر فروری مقرر ہے۔

اس امتحان میں ہر اُردو داں شخص شرکت کر سکتا ہے۔ امتحان میں کامیابی کی حالت میں امیدوار کو "ڈپلومہ ان اسپوکن اُردو" دیا جائے گا جس پر وہ بجا طور پر ناز کر سکے گا۔ اور اپنے نام کے ساتھ ڈپلوما لکھنے کا مجاز ہوگا۔ کلکتہ سے باہر رہنے والے امیدواروں کو گھر بیٹھے امتحان دے کر ڈپلوما حاصل کرنے کی خصوصی رعایت ہے، اور جامعہ اُردو علی گڑھ یا کسی تسلیم شدہ ادارے، بورڈ، یا یونیورسٹی سے زبان و ادب کا امتحان پاس کرنے والوں کو خاص سہولتیں دی گئی ہیں۔ براہ کرم زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس امتحان میں شرکت کر کے اُردو دشمنوں کے چیلنج کا جواب دیں۔

قواعد و ضوابط اور داخلہ فارم کے لئے ۲۵ نئے پیسے کا ڈاک ٹکٹ مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کیجئے۔

پرنسپل، مرکز ادب اُردو کالج، مغربی بنگال، "اردو منزل"
۳۳۔ مڈل روڈ، انٹالی۔ کلکتہ ۱۴

دہلی یونیورسٹی میں اقبال کی شاعری پر تقریر

شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں ۱۶ر جنوری ۱۹۶۲ء کو جناب جگن ناتھ آزاد نے "اقبال کی شاعری" پر ایک پر مغز مقالہ پڑھا۔ صدارت کے فرائض جناب ڈاکٹر تارا چند نے انجام دیے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر شعبۂ اُردو نے ڈاکٹر تارا چند کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ آپ کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے مورخین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تاریخ کے پیچھے اس تہذیبی روح کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے جو مختلف مذہبوں اور فرقوں کی ظاہری رنگا رنگی اور کثرت میں ایک بنیادی وحدت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اُردو زبان بھی انہی تہذیبی تقاضوں کے تحت پیدا ہوئی ہے۔

آزاد صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نارنگ نے فرمایا کہ وہ اُردو کے جدید شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کا سینہ کلام اقبال کا دفینہ ہے۔ انھوں نے شعر اقبال کے بعض عناصر کو اپنے فکر و فن میں جذب کر لیا ہے۔ چنانچہ اقبال کی شاعری سے بحث کرنے کا انھیں پورا حق پہنچتا ہے۔

جناب جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ان کے کلام کی بڑی خوبی حسن بیان اور گداز دل ہے جس کے بغیر شاعری خیال پارہ تو بن سکتی ہے لیکن جگر پارہ نہیں بن سکتی۔ ان کی بیش تر نظموں میں

ایک ایسا لطیف ترنم ہے جو مفہوم کو دلنواز بنانے میں مدد دیتا ہے۔

جناب آزاد کے بعد ڈاکٹر تارا چند نے چند جملوں میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اقبال کو فلسفی کہنا غلط ہے۔ ہاں وہ فلسفیانہ دل و دماغ ضرور رکھتے تھے۔ اگر کلام اقبال کے پس منظر کا مطالعہ کیا جائے تو وہ خالصتاً ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں وطن کی محبت کے نغمے سنائے اور انسانی برابری و اخوت کا پیغام دیا۔ ان کے ہاں اسلام کا تصور وہ نہیں جو متعصب اور تنگ نظر لوگ پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اسلام وسیع ترین بنیادی انسانی قدروں کا حامل ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اقبال کو فارسی میں لکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ اُردو کا وسیع میدان ان کے سامنے تھا۔

(سکریٹری شعبۂ اُردو)

انجمن تعمیر اُردو کے مشاعرے میں جسٹس مُلّا کی شرکت

دلّی۔ انجمن تعمیر اُردو دہلی کا طرحی مشاعرہ ۲۸ر جنوری ۶۲ء کو منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض اُردو کے نامور شاعر جسٹس آنند نرائن صاحب مُلّا نے انجام دیے۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ مجھے خوشی ہے کہ آج میں دلّی کے اُن ادبا و شعرا سے نیاز حاصل کر رہا ہوں جو ہر اتوار کو یہاں جمع ہوتے ہیں، اور اُردو کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں آج کل کوئی ایسی انجمن نہیں۔ صرف انجمن ترقی اُردو ہے۔ انجمن ترقی اُردو ہند ہی اُردو والوں کی ہندوستان میں نمائندہ جماعت ہے ہمیں اس کی مدد کرنا چاہیے اور دوسری تمام ادبی انجمنوں کو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ آج کل اُردو نازک دور سے گذر رہی ہے اس کے تحفظ کے لئے ہمیں ایک مشترک محاذ بنانا ضروری ہے اُردو کو آفت سے بچانے کے لئے آپس کی نا اتفاقیوں کو ختم کرکے ایک بڑے گروہ کی حیثیت میں اُردو کا مطالبہ ہونا چاہیے۔ بھارت میں اُردو کا مطالبہ صحیح ہے اگر جمہوریت میں کوئی بھی مطالبہ منظم طور پر کیا جائے تو یقیناً مانا جائے گا۔

(عزیز وارثی۔ ناظم انجمن تعمیر اُردو۔ دہلی)

پشکن کا ۱۲۵واں یوم وفات

۱۰ر فروری کو روسی زبان کے سب سے بڑے شاعر پشکن کا ۱۲۵واں یوم وفات منایا گیا۔ سوویت یونین کے لوگ پشکن سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ اس موقع پر پشکن کے ناٹک کئے گئے اور ان کی کہانیوں پر فلمیں دکھائی گئیں۔

عظیم الشان مشاعرہ

کرسنٹ سوسائٹی مدراس کے زیر اہتمام جناب آل تاج مکلی کے اعزاز میں ایک دلچسپ مشاعرہ ۳ر فروری ۶۲ء کو شب کے ۹ بجے کرسنٹ ہال میں منعقد ہوا۔ پروفیسر مولانا حبیب مشار سروش ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی نے میر مشاعرہ کے فرائض انجام دیے۔ مشاعرہ کا افتتاح پروفیسر مولانا حافظ محمد یوسف کوکن ایم۔ اے نے فرمایا۔ پروفیسر مولانا سید عظمت اللہ سروری ایم۔ اے نے دل کی شاعری پر ایک بصیرت افروز مقالہ سنایا۔ ہال شائقین ادب سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

(جنرل سکریٹری)

باڑی میں مشاعرہ

حضرت کیف بھوپالی کے اعزاز و صدارت میں یہاں ایک محفل مشاعرہ بزم ادب باڑی کی جانب سے منعقد کی گئی جس میں صدر مشاعرہ کے علاوہ مقامی شعرا نے حصہ لیا۔

آخر میں بزم ادب کے سکریٹری جناب شوکت جلالی نے مہمان شاعر حضرت کیف کا شکریہ ادا کیا اور عوام سے اپنے ادیب اور شاعروں کی قدر دانی کے جذبہ کو بیدار رکھنے اور ان کی تصانیف کو خرید کر پڑھنے کی اپیل کرتے ہوئے مشاعرہ کی کارروائی کے اختتام کا اعلان فرمایا۔

(سکریٹری نشر و اشاعت)

"دائرۂ فکر و نظر" گیا کی ہفتہ وار نشست

۲۸ر جنوری ۱۹۶۲ء کی شام کو "دائرۂ فکر و نظر" کی ہفتہ وار تنقیدی نشست زیر صدارت پروفیسر افصح ظفر ایم۔ اے منعقد ہوئی۔ ادیب گیاوی اور رہبر خالدی کی غزلوں پر معمولی تبصرے ہوئے اور مسعود امام کے افسانے "امرت یا زہر" پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔ پروفیسر افصح ظفر نے اپنے مقالہ "ہمیں تفاوت رہ ....." میں کلیم الدین احمد کی تنقید سے بحث کی۔ جناب ظہیر غازی پوری نے اپنی نظم "آزادی" سنائی۔ آخر میں تنویر جھوچپوری نے ایک غزل پیش کی۔

(معتمد "دائرۂ فکر و نظر" گیا)

سوویت یونین میں ہندی اور اُردو کی درسی کتابیں

ازبکستان کے ایک اشاعت گھر نے ہندی اور اُردو کی درسی کتابیں شائع کی ہیں جو سوویت یونین کے تمام تعلیمی اسکولوں کی چھٹی اور ساتویں جماعت کے نصاب میں داخل ہیں۔ پانچویں جماعت کی کتابیں پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں۔

تاشقند یونیورسٹی میں ہندستانی زبانوں کے اساتذہ نے یہ کتابیں تیار کی ہیں جو سوویت یونین کے ان تمام اسکولوں کے نصاب میں داخل ہیں جہاں ہندی اور اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔

پبلشر نذیر رحمن پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔